

خانوادہ میر حسن: علم و ادب کا گہوارہ

ماجد مشتاق

محمد آصف اعوان

Abstract:

In the history of urdu literature there are few families contributed a lot. Among those families the family of Mir Hassan had a valuable contribution in poetry especially in 'Masnavi' and 'Marsia'. Mir Hassan and his descendents can never be forgotten in urdu literature. This article reflects the glimpses of their work, so a common person view their literary work.

میر حسن دہلوی علم و ادب کا وہ چراغ ہیں جن کی روشنی سے کئی پروانے مستفید ہوئے۔ میر حسن دہلوی میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے ہیں۔ میر حسن دہلوی کے والد گرامی فارسی اور اردو زبان کا عبور رکھتے تھے۔ میر حسن مختلف شہروں میں قیام کرنے کے بعد آخر کار فیض آباد پہنچے۔ پھر لکھنؤ کو مستقل ٹھکانہ بنایا اور علم و ادب کی خدمت میں عمر بسر کی۔ میر حسن نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور علم و ادب کی دنیا میں نام کمایا۔ ان کے نزدیک عشق کی کیفیات انسانی عقل و شعور پر گہرا اثر مرتب کرتی ہیں۔ مثنوی سحرالبیان کی اشاعت کے بعد میر حسن حلقہ ادب میں ایک معتبر ادیب اور شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ میر حسن نے کافی سرمایہ ادب کے لیے چھوڑا ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(1) تذکرہ شعرا: اردو 1774ء (2) بزبان فارسی (3) دیوان اردو

اس کے علاوہ میر حسن نے بارہ مثنویاں لکھی ہیں:

(1) نقل کلاوت (2) نقل زن فاحشہ (3) نقل قصاب (4) نقل قصائی (5) مثنوی شادی آصف

الدولہ (6) رموز العارفین (7) مثنوی درہجو حویلی کہ برکراہیہ گرفتہ (8) گلزار ارم (9) مثنوی تہمنیت عہد (10) مثنوی

دروصف فقر جواہر (11) خوان نعمت (12) سحرالبیان

میر حسن کی وجہ شہرت ان کی مشہور و معروف "مثنوی سحرالبیان" سے ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ "سحرالبیان" کی شہرت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مثنوی سحرالبیان لکھنے سے قبل میر حسن عشق مجازی کی تمام منازل طے کر چکے تھے۔ محرومی عشق اور ناکامی عشق کے اثرات ان کے دماغ پر واضح اثرات مرتب کر چکے تھے۔ غم

کی مختلف کیفیات نے ان کو آغوش رنج غم میں مبتلا کر دیا تھا۔ میر حسن کی شہرت کی وجہ ”سحرالبیان“ کا نہایت سادہ اسلوب ہے اور اگر ہٹ کی بات کی جائے تو سحرالبیان کا پلاٹ سادہ ہے اور مختلف واقعات ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور کئی واقعات دوسری داستانوں میں مل جاتے ہیں۔ میر حسن نے ”سحرالبیان“ میں مختلف کہانیاں بیان کی ہیں جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ باہم جڑی ہوئی ہیں۔ سحرالبیان کا پلاٹ سادہ ہے مگر جزئیات کی پیش کش ”سحرالبیان“ کی وجہ شہرت ہے۔ بعض اوقات تو میر حسن نیکر داروں کی نفسیات کو پرکھا ہے اور نفسیات کو مد نظر رکھ کر ان کے آئینے میں جھانکنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میر حسن کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ انھوں نے انسانی نفسیات اور معاشرہ کے مابین تعلق کو بیان کیا ہے اور انسانی نفسیات اور انسان کے ظاہر و باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی احساسات انسانی کمتری اور بے بسی اور انسانی نفسیات کے آپسی تعلق کو بیان کیا ہے۔ داخل رجحانات اور داخلی احساسات کے علم نے ان کی مثنوی میں نئے زاویہ کو جنم دیا ہے۔ ان کی مثنوی میں نفسیاتی تنقید کا علم ملتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی تنقید کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی افتاد طبع کے پیش نظر اپنی سوچ اور تجربے کی مخصوص حالات کے تحت شاعری کا حصہ بنا ہے۔

”نفسیاتی تنقید ان معانی اور مفاهیم کی دریافت و توضیح سے عبارت ہے جو مختلف محرکات کے تحت

لاشعوری طور پر تخلیقی عمل کا حصہ بن جاتا اور فن پارے کے بطون موجود ہوتے ہیں۔ فرائیڈ

ایڈلر، ڈونگ اور دوسرے نفسیات دانوں نے اس قسم کے داخل محرکات کی خیالی انگیز تاویل پیش

کیں اور نہ صرف انسانی سائیکی اور ادب کا آفاق روشن کیا بلکہ اس علم کو انسان کا نفسیاتی عارضہ ختم

کرنے اور اس کی بارہ بارہ شخصیت کو از سر نو مجتمع کا وسیلہ قرار دیا ہے اور اس سے ادب پاروں کے

تجزیے کا کام بھی لیا ہے۔ نفسیاتی تنقید داخلی رجحانات، برتری اور کمتری کے احساسات اور آرکی

ٹائپل امیج کی معانیت سے انسان اور معاشرے کے عوامل و محرکات دریافت کرتی ہے۔ اسی قسم

کی تنقید ادبی فیصلہ صادر نہیں بل کہ فیصلے کے لیے ادب کے پیمانوں پر ہی انحصار کرتی ہے۔“ (۱)

سحرالبیان میں میر حسن نے وہم و گمان اور انسانی نفسیات کو بڑے مدلل انداز میں بیان کیا ہے اور انسانی وہم و گمان کو ایک مخصوص پیرائے میں ڈھال کر لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔ میر حسن نے مثنوی لکھنے کے لیے بڑی عمدہ کاوش کی ہے اور ہر واقعہ کو بڑی نفاست کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا اعتراف انھوں نے اپنی مثنوی سحرالبیان میں خود کیا ہے:

ابن عمر کی اس کہانی میں صرف

تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے صرف

جوانی میں جب گیا ہوں بس پیر
تب ایسے ہوتے ہیں سخن بے نظیر
ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
تب اس طرح رنگین یہ مضمون کیا (2)

”مثنوی سحرالبیان“ کا اسلوب نہایت سادہ، صاف اور شیریں ہے اور قاری کو اپنے سحر کی گرفت میں جکڑ لیتا ہے اور قاری کو مصنف کا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ میر حسن کی لسانی خوبیوں کو ہر جگہ اجاگر کیا گیا ہے اور ان کے شعری اسلوب کی داد ہر عہد میں دی گئی ہے اور ان کے اسلوب کی نزاکت لطافت اور شوخی مضمون نے ان کے اسلوب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ انھوں نے کسی قسم کی بناوٹ نہیں کی ہے اور اپنے اسلوب میں گلوں سی مٹھاس پیدا کر دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے اور وہی زبان جو آج کا ہر باشندہ بولتا ہے اسے لفظوں کا جامہ پہنا کر صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے:

”زمانے نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعر اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان اور لطافت محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز واداک کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھوک حد تو صیف سے باہر ہے اس کا فصاحت کے کانوں میں قدرت نے کیسی بناوٹ رکھی تھی کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ اس وقت کہا، صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم سب بول رہے ہیں۔“ (3)

میر حسن نے زبان کی عمدگی اور اسلوب پر ہی نہیں توجہ دی بل کہ انھوں نے جزئیات نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور دیگر لوازمات کا مکمل خیال رکھا ہے۔ ہر چیز کی جزئیات بڑی باریک بینی سے بیان کی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری اسی ماحول کا حصہ ہے۔ طوائف کا ذکر ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر اسی ماحول میں زندگی گزارتے رہے ہیں۔ لباس و زیبائش کی بات ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورتوں سے اچھی خاصی واقفیت اور سلام دعا رکھتے ہوں گے۔ عورتوں کے زیورات، لباس اور حسن کی بول بیان کرنے میں جیسے کسی پرانی تصویر کو نیا رنگ دیا گیا ہو۔ وہ لفظوں کے ذریعے ایسے نمونے تراشتے ہیں کہ قاری ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ بتوں میں جان ڈالنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ ہر چیز کی کیفیت اور حالت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت اور تمدن سے مکمل آگاہ ہو۔ برہمنوں کی گفتگو ہو کہ عورتوں کی گفتگو ہو یا طوائفوں کی گفتگو ہو، ہر کردار کی زبان کو ایسے بیان کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کردار خود اپنی زبان بول رہا ہے۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال سے مینا ظر میں دل کشی پیدا کر دیتے ہیں۔ مناظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سارا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ میر حسن نے مصوری کے عمدہ نمونے تراشے ہیں اور مصوری کے ذریعے اپنی بات

قاری تک پہنچائی ہے۔

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار ہراک گل سفیدی سیہناب درد
کھڑے سرو کی طرح چبنے کے جھاڑ کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں کہیں نسرون عجب رنگ پر زعفرانی چمن
پڑی آب جو ہر طرف کو ہے کریں قمریاں سرو پر پینچے
گلوں کا لب نہر پہ جھومنا اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر نشے کا سا عالم گلستان پر
لیے ہاتھ میں نیلے۔۔۔ چمن کو لگیں دیکھنے بھائیس
کہیں غم پاشی کریں گود کر پیروی جمادیں کہیں کھود کر
کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال رہیں ہاتی جوں مست گردن میں ڈال
لب جو پہ آئینے میں دیکھ قد اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ
فرماں صبا صحن میں چاسو دماغوں کو دیتی ہراک گل کی بو
کھڑے نہر پر قافز اور قمرے لیے ساتھ مرغایوں کے پرے
صد اقرقروں کی بطول کا وہ شود درختوں پہ بگلے مند یروں پہ مور
چمن آتش گل سے دکھتا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکتا ہوا

صبا ہو گئی ڈھیریاں کر کے بھول پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول (4)

سحرالبیان میں منظر کشی کی عمدہ تصویریں ہیں۔ کردار نگاری کے حوالے سے یہ مثنوی بڑی اہم ہے۔ بعض ناقدین کے نزدیک سحرالبیان کے کردار کم زور اور نامکمل صفات سے لبریز ہیں۔ نجم النساء، بدر منیر، سبھی کردار ناقص ہیں اور کردار نگاری کی صفات سے عاری ہیں۔ بعض کرداروں کی پیش کش کچھ اُلے سے میر حسن نے بڑی عمدہ خامہ فرسائی کی ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ”سحرالبیان“ کا ہر کردار افسانہ نگاری کے معیار پر پورا اترتا ہے اور ہر کردار اپنی ذہانت اور شرارت کی بدولت اپنی ایک پہچان رکھتا ہے اور اپنے قول و فعل کی وجہ سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ کردار کی نفسیات اور سوچ ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہے اور قاری کے دل میں بجائے وسعت

پیدا کرنے کے لطافت اور گھلاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ نجم النساء کے کردار پر بحث کی جائے تو اس کردار میں جوتوت گفتار ہیوہ داستان کی عمدگی کی بڑی وجہ ہے۔

میر حسن نے اپنے کرداروں کے محاورات اور بول چال میں خوش بیانی اور لطافت پیدا کی ہے۔ ان کے اشعار میں عاشقانہ رنگ اور سوز ملتا ہے۔ جو قاری کو حظ فراہم کرتا ہے۔ یہ قول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی:

”ان کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات خوش بیانی فضا میں

عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میر، سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔“ (5)

میر حسن نے اپنی مثنوی سحرالبیان میں عورت کے جذبات، عشق کی کیفیات اور عورت کے ظاہری خوشبو، زیور، لباس، اداؤں اور گھاتوں کا تذکرہ کیا ہے اور عشق سے دوچار عورت کی کیفیت بھی بیان کی ہے۔ میر سمندی رنگ سے متاثر تھیا ور لکھنویت اور خالصیت کا رنگ شامل کرنا ان کی مجبوری تھی یا نظری عمل تھا۔ اس لیے انھوں نے تشبیہات واستعارات کے ذریعے عورت کے جذبات اور کیفیات کو بیان کیا ہے اور نسوانی جھلک کو بیان کیا ہے اور حسن و عشق کی آپسی جنگ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

”وہاں حسن حسن رہتا ہیہ عشق عشق محض ہوس رانی اور کام جوئی رہ جاتی ہے اور اسی کے باعث

ایک دوسرے کی ظاہری تعریف و توصیف ہونے لگتی ہے۔ لکھنوی خارجی کا یہی راز ہے۔ یہاں

شاعری زندگی معشوق (عورت) کے ظاہری حسن اس کے زیور، اس کے سراپا، اس کے لباس اس

کی چال ڈھال، اس کی اداؤں اور اس کی گھاتوں کو دیکھتے گزرتی ہے۔ اس لیے اس کی شاعری

میں بھی یہی چیزیں اس لیے مواد کام دیتی ہیں۔ اس کی شاعر کا موضوع اور سرمایہ جو کچھ ہے۔

تقریباً وہ سب اسی متاع سے ماخوذ ہے۔ اس کی تشبیہیں، استعارے کنائے، اشارے زیادہ

ترگر دو پیش کے انھیں عناصر سے حاصل ہوتے ہو بل کہ بعض اوقات تو وہ عورت کے محاورے

اور خاص الفاظ بلا تکلف استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے بعض جگہ ذہنی طور پر یہ نسوانی رنگ جھلک پڑتا

بہرینختی اسی ذہن کی پیداوار ہے۔“ (6)

میر حسن نے بھی لکھنوی اثرات کو قبول کیا ہے اور اپنی شاعری میں لکھنوی انداز اپنایا ہے اور عورت کے جذبات اور احساسات کو لفظوں کا جامہ پہنا کر صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ ان کے نزدیک عورت اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی ہے اور اپنے محبوب کی جدائی کے سبب جو اس کی کیفیت ہوتی ہے وہ قابل دیدنی ہوتی ہے۔ وہ محض خیالوں کی دنیا میں نہیں رہ جاتی بل کہ عشق و محبت اور جدائی کے حادثے اسے ذہنی مریض بنا دیتے ہیں اور وہ دماغی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثنوی سحرالبیان میں بدرمیر کی بے نظری جدائی میں جو کیفیت ہوتی ہے وہ جذبات نگاری کی ایسی مثال ہے جو روح زمین پر ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں

جذبات نگاری کے عمدہ نمونے تراشے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

دوانی سی طرف پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
خفا زندگی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تب غم کی شدت سے پھر کانپ کانپ
اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسا نہ منہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کہ ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے
تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کچھ کوئی
کہا خیر بہتر ہے مگلوایئے
کسی نے کہا سیر کیجئے ذرا
کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا
جو پانی پلانا تو پینا اسے
غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے

تشبیہات واستعارات نے، ”مثنوی سحرالبیان“ کے حسن میں اضافہ کیا ہے اور ادائے مطلب کے حسن

کو بڑھایا ہے۔ مگر اظہار مطلب میں رکاوٹ پیدا نہیں کی ہے۔ تشبیہات نہایت سادہ ہیں اور قاری تشبیہات واستعارات کے چکر میں لفظی رعایت کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوتا بلکہ اصل مطلب ومفاہیم تک رسائی حاصل کر لیتا ہیا ورحسن شاعری کو پہچان لیتا ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو کی بات کی جائے تو وہ عمدہ اور خوب صورت تذکرہ ہے۔ ہر ردیف کو تین طبقوں میں تقسیم کر کے ساری کتاب میں نزاکت اور لطافت پیدا کر دی ہے۔ بجائے ہرزہ سرائی کے اصل حالات بیان کیے ہیں اور کسی کی مدح سرائی کی بجائے عین حالات وواقعات بیان کیے ہیں بعض غلطیاں اور فروگزاشتیں موجود ہیں مگر مفید اور عمدہ معلومات نکلتی ہیں۔ سوز و گداز اور درد مندی کی مختلف کیفیات قاری کی آنکھوں کو خبرہ کرتی ہیں اور اسے فہم و فراست کی دعوت دیتی ہیں۔ محاورے اور نپے تلے اور گھسے پٹے الفاظ کو شاعری کی شہ رگ قرار دینے کی بجائے انھوں نے اسے نت نئے مضامین سے نوازا ہے۔ میر حسن نے ساری عمر بزرگ شعراء^۱ کے انداز میں شاعری کی ہے اور اپنی غزلوں میں جذبہ واحساس، طرز واسلوب اور فکر و خیال کو جگہ دی ہے مگر اپنا ایک واضح اسلوب قائم رکھنے میں وہ ناکام رہے ہیں بقول غلام:

”حسن ساری عمر بزرگ اور نئی نسل کے شعراء^۱ کی پیروی کرتے رہے لیکن اپنا منفرد رنگ قائم نہ کر سکے۔ ان کی غزلوں میں جذبہ واحساس، طرز واسلوب، فکر و خیال لہجہ وآہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنوی رنگ غزل کا ابتدائی رنگ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔“ (7)

میر حسن دہلوی کے جانشین اور فرزند میر مستحسن خلیق

میر حسن دہلوی کے بیٹے اور میر انیس کے والد گرامی میر مستحسن خلیق ایک نامی گرامی شاعر تھے۔ انھوں نے اردو ادب میں وہ مقام و مرتبہ پایا جس کے وہ حقیقی حق دار تھے۔ وہ ایک ایسے فن کار اور ادیب تھے جن کا کلام رہتی دنیا تک پڑھا جائے گا۔ بعض محققین اور ناقدین کے بقول میر خلیق اور میر انیس کا کلام ملتا جلتا ہے اور دونوں میں ایک منفرد رنگ اور لب ولہجہ پایا جاتا ہے۔ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو میر خلیق کے ہیں مگر میر انیس کے کھاتے میں درج ہیں اور لوگ انھیں میر انیس کے مرثیے سمجھ بیٹھے ہیں۔ اصل میں دونوں لکھاریوں کی زبان مشترک اور لسانی ہم آہنگی کی وجہ سے کلام میں چاشنی پیدا ہو گئی ہے اور عقل ناقص کے حامل قارئین کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کون سا کلام کس شاعر کا ہے۔

”حقیقت یہ ہے کہ باپ نے بیٹے کی لسانی تربیت اس طرح کی کہ دونوں کی زبان شیر و شکر آمیختہ

ہو گئی اور کچھ امتیاز من و تو باقی نہ رہا۔“ (8)

طرزِ تحریر اور اسلوب کا آپس میں ملنا یہ ایک فطری بات تھی کیوں کہ میر خلیق نے زبان کا رس اور مٹھاس،

لوح اور شیرینی میر حسن سے ورثہ میں حاصل کی تھی اس لیے زبان میں سادگی اور مٹھاس کا پایا جانا فطری عمل تھا۔ میر خلیق کا ایک دیوان منظر عام پر موجود ہے۔ میر انیس کی شاعری کے مختلف موضوعات حقیقت میں باپ دادا سے ورثے میں حاصل کیے ہوئے ہیں۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان جس معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے اس معاشرے کے رسم و رواج اور مذاہب و عقائد کو اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے اور معاشرے کے رسم و رواج کو اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میر خلیق نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس معاشرے کے رہن سہن اور مذہبی عقائد کو اپنایا۔ میر شبیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے وہ حضرت امام حسین سے خاصی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ شہادت حسین اور غم حسین سے وہ اس قدر رنجور ہو جاتے تھے کہ ان پر بے ہوشی کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور عشق حسین میں مگن ہو کر دنیا کو بھول جاتے تھے۔ میر خلیق نے اپنے مرثیوں میں ایسے واقعات قلم بند کیے۔ جو قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں اور اس کی آنکھوں سے بے شمار آنسو نکلتے ہیں اور اس کو عالم غیب لے جا کر غم و حزن کی کیفیت عطا کر دیتے ہیں۔ میر نے اپنے مرثیوں میں ایسی فضا پیدا کی ہے جو تمام روح انسان کو اشک بہانے پر مجبور کرتی ہے اور واقعہ کر بلا کو من و عن بیان کرتی ہے حقیقی مرثیہ وہی ہوتا ہے کہ جو تمام واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری خود کو ان تمام مناظر سے ربط جوڑتا محسوس کرے۔

میر خلیق کے مرثیوں کا یہ فن ہے کہ ان کو پڑھنے کے بعد قاری اپنے اوپر ایسے کیفیات طاری کر لیتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشاریں اس طرح بہتی ہیں کہ ہر سوں جل تھل ہو کر رہ جاتا ہے اور فضا سو گوار ہو کر رہ جاتی ہے:

”مرثیہ میں موجود حزن کی فضا اردو ادب کی تمام اصناف پر بھاری نظر آتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ

واقعہ کر بلا کے حوالے سے لکھے گئے مرثیے پتھروں کی آنکھ سے آنسو اور پہاڑوں کے سینے چاک

کرنے والے دل دوز واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ تو کچھبالغہ نہ ہوگا۔“ (9)

میر خلیق کے مرثیوں میں تمام اجرائے مرثیہ اپنی آب و تاب کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ چہرہ، سراپا، رخصت، رجز، رزم، شہادت ہو یا۔ تمام اجزا ایک دوسرے کیساتھ باہم جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو تمام واقع قاری کی اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کرداروں کی نفسیات اور خیالات و جذبات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تمام جزئیات ایک رنگ میں رنگ جاتی ہیں اور تمام واقعہ باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گھر سے جب بہر سفر سید عالم نکلے

سر جھکائے ہوئے باریدہ پر غم نکلے

خولیش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے
رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے
رات سے گریہ زہرا کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لیجاتی ہے (10)

گھر سے نکلنے کے بعد اور پھر شہادت حسین تک کے تمام واقعات کو میر خلیق اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں میں گہرے بادل برسنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ واقعات قاری کی وہ کیفیت کر دیتے ہیں کہ وہ حواس باختہ ہو کر عالم ہو میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے جذبات دنیاوی مجروح ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ غم کے خزانے لے کر عشق حقیقی کی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات لکھاری اس طرح واقعات اور مناظر پیش کرتا ہے کہ قاری جذبات کی رو میں بہہ کر طیش میں آ جاتا ہے اور اس کے اندر طاقت اسکندری پیدا ہو جاتی ہے اور حضرت امام حسینؑ سے عقیدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسانی آلات اس کیفیت اور محبت کو نہیں مآپ سکتے۔ عالم ہو میں رہنے والا انسان تڑپ اٹھتا ہے اور حالت شام غریباں پر اٹک فٹانی کرنے لگتا ہے اور موتیوں کے انبار لگا دیتا۔ انسانی عقل ناقص اس کیفیت سے کافی حد تک متاثر ہو جاتی ہے اور عشق و محبت کی قید میں رہنا پسند کرتی ہے۔

شہنشاہ مرثیہ: میر انیس

میر انیس میر خلیق کے فرزند اور میر حسن دہلوی کے پوتے ہیں۔ 1801ء میں وہ فیض آباد لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور فیض آباد کے گرد و نواح سے حاصل کی۔ مصحفی کی خدمت میں کچھ دن کام کیا اور پھر خود مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور ادب تخلیق آنے لگی۔ میر انیس نے فن سپہ گری میں بھی مہارت حاصل کی اور میر کاظم علی خاں سے لکھنؤ میں فن سپہ گری کے گریکھے۔ کچھ عرصہ پٹنہ میں بھی گزارا اور پھر حیدر آباد کی بھی یا تراکی اور واپس آ کر حیدر آباد میں مستقل قیام کیا اور الہ آباد کے مشاعروں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر شرکت کی اور بڑا نام کمایا۔ بہ قول ذکاء اسد خاں:

”میں بھی دھوپ میں کھڑا ہو کر دور سننے لگا یہ معلوم ہوتا تھا کہ میر پر ایک کل کی گڑیا بیٹھی ہوئی لڑکوں
پر جادو کر رہی ہے۔ میرے کپڑے پیسے سے تر ہو گئے اور پاؤں خون اترنے سے شل ہو گئے لیکن
جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا اور ان کا مرثیہ سنتا رہا۔ مجھے کوئی بات محسوس نہ ہوئی میں نے
اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق الفطرت اثر پیدا
ہوتے دیکھا۔“ (11)

میر انیس کی کلیات ”کلیات مراٹھی“ کینام سے چھپ چکی ہے اور اس کتاب میں بے شمار موتی اپنی آب

وتاب کے ساتھ ایک خاص سلیقے کے ساتھ نگینے میں جڑے ہوئے دکھائی دیتی ہیں اور پڑھنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ میرانیس کی طبیعت میں قناعت عاجزی اور تصنع سے نفرت تھی۔ وہ اپنے عزت و وقار کا بڑا خیال رکھتے تھے اور جب وہ مرثیہ پڑھتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا کوئی سیاسی مدبر تقریر کر رہا ہو اور سامعین کو اشارتاً کنا بیانات سمجھا رہا ہو۔ میرانیس نیریشیوں کے علاوہ سلام، قطعات اور رباعیاں بھی لکھیں۔

مرثیہ کا موضوع انتہائی متین اور محدود ہوتا ہے اور ایک مخصوص پیرائے میں رہ کر مرثیہ نگار کو مرثیہ لکھنا ہوتا ہے۔ مرثیہ نگار کا یہ فن کمال ہوتا ہے کہ اظہار کے انداز سے اس کو شہرت کی بلندیوں تک دکھاتے ہوئے اسے اپنے اسلوب کے ذریعے بیان کی قوت عطا کرے۔ میرانیس نیریشیہ، استعارہ، کنایہ، مترنم الفاظ اور مناسب صنائع بدائع کے ذریعے اپنے کلام میں چاشنی اور موسیقی اور کلام میں جدت ادا پیدا کر دی ہے۔ میرانیس کا ذخیرہ الفاظ نظیر اکبر آبادی سے البتہ کم ہے مگر الفاظ کی فوج ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے اور ان کے حکم کی تعمیل کرنے میں مگن رہتی ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال موقع و محل کے مطابق کرتے ہیں یہی ان کی بلاغت کی کامیابی کا ثبوت ہے۔ ان کی بلاغت ہی ان کی شاعری کی بڑی وجہ ہے۔ وہ لفظوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اور لفظوں کے ہیر پھر سے نئے موضوعات اور مطالب تراشتے ہیں اور قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

”الفاظ کی یہ بے شمار فوج ان کے سامنے مودب کھڑی رہتی ہے اور وہ اسے جس طرح چاہتے ہیں

استعمال کر سکتے ہیں پھر وہ الفاظ کو موقع و محل کے مطابق استعمال کرنے کا گربھی جانتے ہیں۔“ (12)

بلاغت کا جو ملکہ میرانیس کو حاصل ہے شاید ہی کسی ادیب کے حصے میں آیا ہو۔ وہ لفظوں کے حسین امتزاج اور ہیر پھیر سے بلاغت پیدا کرتے ہیں اور قاری کو دور طہ حیرت میں ڈال کر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں جس سیقاری کے دل میں عشق حسین کی تڑپ اور بھی بڑھ جاتی ہے:

اعدا پکارتے تھے کہ اے شاہ دین پناہ
باقی ہے کوئی اور کہ بس ہو چکی سیاہ
عباس ساتھ اب کوئی ہو گا نہ خیر خواہ
بھیجو کسی کو جلد کہ ہم دیکھتے ہیں راہ
چننے دو گل سیر کو شہادت کے باغ سے
کب تک بچائیے گا کلیجے کو داغ سے
دنیا سے کوچ کر گئے عباس نامدار
اب بے چراغ ہے لحد شر کردگار

حضرت کا صبر و شکر ہے عالم پہ آشکار
مثل خلیل کیجئے فرزند کو نثار
آہیں نہ بھریئے پیٹ کے سر کو نہ دوئیئے
جب جانیں ہم کہ کھو کے سیر کو نہ دوئیئے (13)

یہ زبان غیر اور دشمن حسین کی ہے جنہوں نے طنزاً حضرت امام حسینؑ کو لاکارا اور پکارا ہے۔ میرانیس نے کس منفرد اور اچھوتیانداز میں واقعہ کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔ مثال ملنا مشکل ہے۔ میرانیس کیہاں طنزیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ جس میں انہوں نے دشمن اور اپنوں دونوں کے طنزیہ کلمات کو لفظی جامہ پہنایا ہے۔ ان کی شاعری میں طنزیہ کاٹ مخالفین کی طرف سیہی نہیں بل کہ ساتھیوں کی طرف سے بھی ملتی ہے۔ وہ آپسی رنجش کو بھی طنز کا نشانہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور تشبیہات و استعارات کے ذریعے خوب صورت الفاظ میں اصل واقعہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ میرانیس کے ایک مرثیے سے طنزیہ اندازِ بیاں کی مثال ملاحظہ ہو:

زینب نے کہا جس میں رضائے شمالی
میں نے تو کوئی بات نہیں منہ سے نکالی
کیا غم ہے نہ پوچھا مجھ سے ماں سے تو رضالی
مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک پالنے والی
صدقے کئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے
سمجھیں تو مراحق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے (14)

کردار کسی بھی ڈرامے، ناول، افسانے اور مثنوی کی علاوہ مرثیہ کی جان تصور کیے جاتے ہیں۔ مصنف اپنے خیالات و احساسات و جذبات کرداروں کے ذریعے قاری تک منتقل کرتا ہے اور کردار ہی تمام واقعات کو مخصوص وقت منظر عام پر لاتے ہیں۔ بہترین مصنف کرداروں کی پیش کش میں فہم و فراست سی کام لیتا ہے اور کردار کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر اسے مناسب وقت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میرانیس نے اپنے مرثیوں میں کرداروں کی کیفیت اور صورت حال ایک نوعیت کی ہے۔ ہر کردار مکمل ہے اور بوقت پیش کش وہ اپنی باری اچھی طرح سے ادا کرتا ہے اور بعض اوقات ایک ہی کردار مختلف جذباتی کیفیات کو بیان کرتا ہے اور تمام جذباتی لمحوں کو بڑی عمدگی کے ساتھ ساتھ پیش کرتا ہے۔ کردار کے جذبات کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے کردار کی سوچ کے مطابق اس کے خیالات و احساسات کی عکاسی کی ہے۔ کردار کی جذباتی کیفیت ملاحظہ ہو:

فرما کے یہ غش ہو گئیں اور پھر ہوئیں ہشیار

پوچھا کہ کدھر ہے علی اکبر مرا دل دار
 بانو نے کہا بادیدہ خونبار
 اب فرق بصارت بھی یا شیر ابرار
 اب کے جو غش آیا تو گزر جائے گی زینب
 لے جائیں لاشے نہیں مر جائے گی زینب (15)

مرقع نگاری کا فن بھی میرا نہیں کو حاصل ہے۔ وہ لفظوں کے ذریعے تصور بناتے ہیں اور پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں اور پھر اس میں اپنے جذبات شامل کر کے اسے دل کش اور حسین بنا دیتے ہیں۔ خارجی مناظر اور جذبات نگاری کے تحت وجود میں آنے والے مرقع انسان کی سوچ کو تبدیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ لفظوں کے ذریعے تصور بنانے کا فن خاصا مشکل فن ہے۔ مگر میرا نہیں نے اس فن کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے سراپا نگاری اور حالات و واقعات کو من و عن لفظوں کا جامہ پہنا کر بیان کر دیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظی تصویریں زندہ ہو کر روح زمین پر حرکت کرنے لگ گئی ہوں۔ ان کے ایک مریضہ دیکھیے جس میں شہادت امام حسینؑ کا منظر بڑا جاں گداز انداز میں بیان ہوا ہے۔ کہیں کہیں سراپا نگاری کا شکوہ بھی موجود ہے البتہ زبان کی سادگی وہ بھی دور کر دیتی ہے اور پھر در دور وقت کا بیان تفصیل الفاظ اور شکوہ تراکیب کا ہرگز مستعمل نہیں ہو سکتا اور قاری غم میں ڈوب جاتا ہے۔

گھبرا کے اس نے جانب مقتل جو کی نظر
 دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر
 لڑکی جو ساتھ تھی پکاری پیٹ کر
 میں لٹ گئی پھوپھی مرے بابا کا ہے یہ سر
 زلفیں لہو بھری ہوئی رخ پہ لنگتی ہیں
 ہے شہ رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں (16)

انہیں کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ ایک کردار کی تصویر پیش کر کے دوسرے کردار کی زبان سے اس پر تبصرہ کرادیتے ہیں اور اپنے اشعار کی تاثیر اور مفاہیم کو بڑھا دینے اور پڑھنے والے کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ شہادت امام حسینؑ کی کیفیات اور مناظر کو بیان کرنے کے لیے ان کی بیٹی کی زبان سے درد انگیز کلمات نکلوائے گئے ہیں اور غم و یاس کی فضا قائم کی گئی ہے:

بیٹھی تھیں پس پردہ زینب ناچار

چہرہ تھا کبھی زرد کبھی سرخ تھے رخسار
بے تابی میں غصہ سے فرماتی تھیں ہر بار
تو دیکھ تو نیچے ہیں کہاں تک مرے دل دار
کھائے میں ابھی زخم گھوڑوں سے گرے ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ فوجوں سے گھرے ہیں (17)

میر انیس کے ہاں لفظ اور قافیہ کی غلطیاں موجود ہیں مگر ان کی تحریر کا حسن تمام تر خامیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ بعض مقامات پر وہ جذبات کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں مگر تمام خامیوں کے باوجود وہ ایک عظیم شاعر اور مرثیہ نگار ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کافی تعداد میں رباعیاں بھی لکھی ہیں اور رباعیوں کے اندر بھی شہادت امام حسین کا تذکرہ کیا ہے ان کی شاعری میں تصوف، تصور وحدت الوجود، تصور وحدت الشہود کے نظریے کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے خیالی اور حمد و ثناء کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے معاشرتی موضوعات کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے اور بہت سے اخلاقی موضوعات کو صفحہ قرطاس کی ہر مشکل کے آگے ایک بڑا شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے:

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سوگھتا ہوں بو تیری ہے
رتبہ جیسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثناء آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہو صدا دیتا ہے (19)

میر مونس

میر مونس کا اصل نام میر محمد نواب اور تخلص میر مونس تھا۔ وہ میر انیس کے چھوٹے بھائی اور میر خلیق کے بیٹے میر حسن دہلوی کے پوتے اور میر ضاحک کے پڑپوتے تھے۔ میر مونس بڑے زود گو شاعر اور گوشہ تنہائی کو پسند کرتے تھے۔ آپ اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ ہر ماہ کی چھبیس تاریخ کو تازہ مرثیہ پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تمام مجلس کو اپنی جادو میں گرفتار کر لیتے تھے۔ اب کے مرثیوں کی زبان کی بناوٹ سادہ اور سلیس ہے۔ بعض اوقات وہ سنگلاخ زمینوں

میں مرثیہ کہنے اور بڑے بڑے مرثیہ لکھنے والوں کو پیچھے چھوڑ دیتے تھے۔

”مرثیہ گوئی میں کسی طرح اپنے بڑے بھائی سے کم نہ تھے گوشہ نشینی کی وجہ سے مشہور نہ

ہوئے۔“ (20)

بعض محققین اور ناقدین کی رائے ہے کہ وہ میر انیس و دیر کی آپس کی چپقلش کی وجہ سے مشہور نہ ہو سکے اور ان کو وہ مقام و مرتبہ اور عزت نہ مل سکی جس کے وہ حقیقی حق دار تھے۔ ان کو تصوفی و تعریف اور خصائص بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہے اور وہ کسی بھی چیز کی جذبات کو بڑی باریک بینی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور قاری کے ذہن میں کئی طرح کے وسوسے مہیا کر دیتے ہیں۔ اس کی عجلہ وہ جب قاری ان کی شاعری کو پڑھتا ہے تو اس کے اندر تلاش و جستجو کا نیا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک کامل محقق بن جاتا ہے۔

ان کے کلام میں بے جا مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے اور اصلی واقعات تک رسائی حاصل کرنا خاصا مشکل اور ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں اور اس کے ذہنی اچھ کو متاثر کرتے ہیں:

کس کروفر سے فوج پہ تنج جری چلی
ہر سر پہ کھیلتی گویا پری چلی
خشکی پہ گاہ چلی کبھی سوئے تری چلی
خالی کیا صفوں کو لہو میں بھری چلی
ظاہر تھی بانگین سے کجی رنگ لال تھا
تلوار تھی کہ خوں کی شفق میں ہلال تھا (21)

میر انیس

میر حسن دہلوی کے پوتے اور میر خلیق کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور میر انیس اور میر مونس کے بھائی تھے۔ علم و ادب سے خاصا شغف رکھتے تھے۔ مگر وہ مقام و مرتبہ جو اس کے دونوں بھائیوں کو نصیب ہوا اسے نہ مل سکا۔ اپنے والد گرامی سے اصلاح لیتے تھے اور اپنے بھائی انیس کی طرح سپہ کرمی کا بھی شوق تھا۔ مختلف ادوار میں ملازمتیں کی۔ نواب رجب علی خاں کے ہاں بھی ملازمت کی اور رام پور میں قیام کے بعد لکھنؤ میں آخری سانسیں مکمل کیں۔

میر انیس کے کلام میں چاشنی اور لطافت ہے۔ زبان نہایت سادہ ہے اور الفاظ کا بے جا استعمال بھی نہیں ہے اور خوب صورت لفظوں کا چناؤ ان کے کلام کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ رعایت لفظی اور سنگلاخ زمینوں میں مرثیہ گو تھے۔ ان کی زبان نہایت صاف اور اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ وہ قاری کو سیدھے الفاظ میں سمجھاتے ہیں اور اپنے خیالات سادہ الفاظ میں منتقل کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں نغمگی اور موسیقیت ہے اور بلاغت کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بلاغت کی بلند یوں کو چھو کر بارگئے ہوں۔ وہ مبالغہ آرائی

میں ملکہ رکھتے ہیں اور مبالغہ آمیزی سے کلام میں چاشنی اور سلاست پیدا کر دیتے ہیں۔ خارجیت کی جھلک اور خارجی رنگ آہنگ بھی ان کے کلام کی زینت تصور کیا جاتا ہے۔

میرانس جس چیز کی بھی تعریف کرتے ہیں مبالغہ آمیزی کے انبار لگا دیتے ہیں اور قاری کو وسوسوں میں ڈال کر ایک مخصوص حد تک فید کر کے رکھ دیتے ہیں:

وہ تیغ برق سے بھی سوتھی جو شعلہ بار
جنگل میں آگ لگی تھی پر تو سے بار بار
پیتی پہ آئی اوج سے جو ہو کے بے قرار
شعلے کی طرح کانپ گئے ڈر سیابل ناد
جب کوند کر اٹھی تو شرارے عیال ہوئے
ثابت ہوا ہلال سے تارے عیال ہوئے (22)

میرانس نے اپنے کلام میں تکلف اور تصنع سے کام لیا اور اسے مشکل پسندی کی طرف دھکیل دیا کیوں کہ یہی لکھنوی تہذیب کا شیوہ تھا اور لکھنوی تہذیب اس بات کی گواہ تھی کہ نگاری اور مشکل پسندی، اسلوب اس کا زیور ہیں اور تمام لکھنوی شعراء نے مشکل پسندی اور خارجی حالات اور موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

”اردو تنقید لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں میں جو فرق کرتی ہے۔ وہ کسی حد تک قابل اتنا ہے یہ دونوں نظریہ اردو غزل کے دو مختلف رجحانات کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں جہاں دہلی کی شاعری کا تعلق صفائی اور سادگی سے ہیوہاں اس لکھنوی شاعری کا تعلق تکلف اور تصنع سے ہے۔ ان میں ایک رجحان کی بنیاد دلی احساسات و جذبات پر ہے تو دوسرے کی خارجی عناصر

پر۔۔“ (23)

میرانس نے لکھنوی اور دہلوی تہذیب کے آپسی تعلق اور اشتراک کے علاوہ تضاد کے رشتے کو قائم کیا اور لکھنوی تہذیب کے عمدہ نمونے تراشے ہیں اور مبالغے کی انتہا سے تاثیر کو غائب کر دیا ہے۔ لکھنوی تہذیب کے اثرات کا میرانس کی شاعری میں پایا جانا فطری عمل سے اور انسانی حیات و کائنات کے مشاہدہ میں لکھنوی تہذیب کے نہاں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بہتر یہ ہے شعراء نے جہاں لکھنوی رنگ میں شاعری کی ہے وہاں میرانس نے بھی شاعری کر کے لکھنوی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں شاعری کرنا میرانس کا فن تھا۔ سو اس نے اس میں طبع آزمائی کی۔

خانوادہ میر حسن دہلوی کے آخری چشم و چراغ میر تقی

میر تقی میر انیس کے بیٹے، میر خلیق کے پوتے اور میر حسن دہلوی کے پڑپوتے تھے۔ علم و ادب کی دنیا میں خاصا مقام رکھتے تھے۔ وہ میر انیس کے باقی صاحب زادوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ میر تقی نے شاعری میں اپنے والد سے تربیت حاصل کی اور شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ میر تقی نے اردو اپنے والد اور فارسی ماہر استاد میر محمد عباس سے حاصل کی۔ ان کی ذہانت اور قابلیت کے چرچے آئینہ وسقان میں تھے اور ان کی قابلیت کی بدولت ہی ان کے والد نے ان کو میر انس کے پاس بھیجا۔

میر تقی کو ہی وہ واحد ملکہ حاصل ہے۔ جنہوں نے مرثیہ میں پہلی بار ساقی نامے کا اضافہ کیا۔ ان کی زبان سادہ اور صاف شستہ اور رفتہ ہے اور سادگی اور سلاست کی وجہ سے ان کی زبان بڑی مشہور ہے۔ مرثیہ میں ساقی نامہ کا اضافہ کر کے میر تقی نیا یک درخشاں باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے مرثیہ زبان و بیان کے لحاظ سے عمدہ ہیں لیکن فنی اعتبار سے میر انس سیکم ہیں:

ساقیا! ہاں مے گلغام ملا ہونٹوں سے
ساغر نعرو دل آرام ملا ہونٹوں سے
ساز گیر و فرح انجام ملا ہونٹوں سے
آج لبریز کوئی جام ملا ہونٹوں سے
نشہ بادہ اعجاز بیانی بڑھ جائے
ہو زباں صاف طبیعت کی روانی بڑھ جائے (24)

میر انیس کی ایک مرثیہ ملاحظہ ہو۔ جس میں انھوں نے تلوار کی تعریف کی ہے اور بے جا مبالغہ آمیزی کچھ ہر دکھائے ہیں اور مبالغہ آمیزی کا عمدہ ثبوت فراہم کیا ہے:

یہ تیغ وہ ہے سیل فنا کہتے ہیں جس کو
یہ برق وہ ہے قہر خدا کہتے ہیں جس کو
باڑھ اس کی آفت ہے بلا کہتے ہیں جس کو
منہ اس کا وہ منہ ہے کہ وہ فنا کہتے ہیں جس کو
جاتی ہیں بے جان یہ جب آتی ہے سر پر
ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کب آتی ہے سر پر (25)

علم و ادب کی تاریخ میں میر حسن کا خاندان نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

حواشی:

- 1- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، (لاہور: عزیز بک ڈپو، 1991ء)، ص: 464
- 2- میر حسن دہلوی، سحر البیان، تصحیح و ترتیب: رشید حسن خان، (دہلی: مکتبہ جامعہ، 1984ء)، ص: 36
- 3- آزاد، محمد حسین، آب حیات، (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ، 1967ء)، ص: 236
- 4- میر حسن دہلوی، سحر البیان، ص: 87
- 5- نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دلی کا دبستان شاعری، (اتر پردیش: اتر پردیش اکادمی، 1997ء)، ص: 368
- 6- ایضاً، ص: 77
- 7- غلام آسی رشیدی، اردو غزل کا تاریخی ارتقاء، (لاہور: دارالشعور، 2015ء)، ص: 157
- 8- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص: 193
- 9- مطلوب حسین، اردو غزل میں حزن و غم عناصر، (فیصل آباد: لائل پور پبلشرز، 2018ء)، ص: 25
- 10- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص: 193
- 11- امجد علی شعری، حیات انیس، (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، 1997ء)، ص: 47
- 12- حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، (لاہور: یونیورسٹی بک ایجنسی، 1978ء)، ص: 428
- 13- میر حسن دہلوی، سحر البیان، ص: ۲۲۱
- 14- ایضاً، ص: 306
- 15- ایضاً، ص: 313
- 16- ایضاً، ص: 350
- 17- ایضاً، ص: 352
- 18- ایضاً، ص: 366
- 19- ایضاً، ص: 368
- 20- حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، ص: 255
- 21- ایضاً، ص: 436
- 22- ایضاً، ص: 431
- 23- غلام آسی رشیدی، اردو غزل کا تاریخی ارتقاء، ص: 145
- 24- حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، ص: 437
- 25- ایضاً، ص: 438